پگھلنا علم کی خاطر مثالِ شمع زیبا ہے
بغیر اس کے نہیں پہچان سکتے ہم خدا کیا ہے

دیوانِ غالب

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور

Priec 0-12

Ghalib, Asadullah
[Poetical work]

دیوانِ غالب
اُردُو

جس کو

شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور کشمیری بازار

نے

اپنے مطبعِ علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام

میاں فیروز الدین پرنٹر چھاپا

قیمت ۱۰/

Lahore, Ghulam Ali + Sons.

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

المعروف بہ میرزا نوشہ

مرزا ۱۲۱۲ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباء واجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔ ان کا سلسلہ نسب تور ابن افریدون تک پہنچتا ہے جب خاندان کیان کا تمام ایران و توران پر پورا پورا تسلط ہو گیا۔ اور توران کے حکمرانوں کی عظمت و شان دُنیا سے اُٹھ گئی۔ اور مدتوں تک اُن کا بخت و دولت پلٹے کھاتا رہا۔ آخر کار اُسی خاندان میں ایک شخص ترسم خان نامی پیدا ہوا۔ اُنہیں کی اولاد میں سے مرزا کے دادا تھے۔ جو شاہ عالم کے عہد میں اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر ہندوستان میں آئے۔ اور بعض امرائے ہند کی اعانت و امداد سے دربار شاہی میں ایک عہدۂ جلیلہ پر مقرر ہوئے۔ اُن کی مشہور اولاد نرینہ میں سے دو شخص تھے۔ ایک عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دُولھا۔ دُوسرے نصر اللہ بیگ خاں۔ عبد اللہ بیگ خاں نے ایک مشہور خاندان آگرہ میں شادی کی۔ اور تمام عمر بطریق خانہ داماد سسرال ہی میں بسر کی۔ اُن کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب اور دوسرے یوسف خاں جو ایام شباب میں مجنوں ہوئے۔ اور غدر ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں مختلف درباروں میں مناصب جلیلہ پر ملازم رہے۔ لیکن آخر عمر میں وہ راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور کے یہاں ملازم ہوئے۔ اُن دنوں میں ریاست کا کوئی زمیندار باغی ہو گیا تھا۔ جس کی سرکوبی کے لئے راجہ کو فوج بھیجنی پڑی جس میں مرزا کے والد کو جانا پڑا۔ لڑائی کے ہنگامہ میں اُن کے ایک

گولی لگی، جس کے جانبر نہ ہو سکے۔ گر قدردان آقا یعنی بختاور سنگھ نے اس جانبازی کے صلہ میں دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونوں بچوں کی پرورش کے لئے مقرر کر دیا۔ جو مدت تک جاری رہا۔ مرزا غالب اور مرزا یوسف خاں اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں کے زیر سایہ عاطفت پرورش پاتے رہے۔ آخر عہد انگریزی ہندوستان میں قایم ہوا۔ اور اسی زمانہ میں مرزا نصراللہ بیگ خاں بعہدۂ رسالداری سرکار انگریزی میں ملازم رہے۔ اور اُن کی ذات و رسالہ کی تنخواہ میں دو پرگنہ سونک سونسا جو نواح اکبر آباد میں ہیں۔ اُن کے نامزد کیئے گیئے۔ وہ ان کی زندگی تک ان کے نام رہے۔ یکایک نصراللہ بیگ خاں کو بھی سفر عدم پیش آیا۔ جس میں مرزا اور اُن کے بھائی کو دقتیں اُٹھانی پڑیں۔ دونوں پرگنہ تو نہ رہے۔ مگر سرکار نے ریاست فیروزپور جھرکہ سے ان دونوں کی پنشنیں مقرر کرادیں۔ جس سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا غالب مرحوم کو ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ بسبب تعلقات قلعہ پھر کچھ روز یہ پنشن بند ہو گئی۔ اور مرزا کی بے گناہی کے بعد پھر پنشن جاری ہو گئی۔ جو آخر عمر تک بدستور رہی۔

اگرچہ مرزا غالب مرحوم سن شعور بلکہ شادی ہونے کے بعد تک آگرہ ہی میں سکونت پذیر رہے۔ مگر سات برس کی عمر کے بعد دلی میں آتے جاتے رہے۔

مرزا کی تعلیم و تربیت

رسم زمانہ کے مطابق آگرہ کے ایک مشہور معلم شیخ معظم کی صحبت میں جاری تھی۔ مگر قسام ازل کے یہاں سے اُن کو فارسی کا ایک ذوق سلیم عطا ہوا تھا۔ اس پر ایک اور یہ لطیفہ غیبی ہوا۔ کہ کوئی شخص ژند و پاژند کا زبردست عالم جو اَب مسلمان ہو گیا تھا۔ ایران سے

سیاح خانہ آگرہ میں وارد ہوا۔ مرزا سے کسی طرح ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے اس کو دو برس تک مہمان رکھا۔ اور اس سے علم و زبان۔ فارسی کی تکمیل کی۔ اس شخص کا نام عبدالصمد تھا۔ اسی شخص کے فیض صحبت کی بدولت مرزا فارسی کے ایک زبردست زبان دان بنے۔ اور عمر بھر ان کو اس تعلیم پر ناز رہا۔

مرزا کی شادی

چونکہ مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں کا رشتہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا۔ اس لئے بغیر کسی زحمت کے نواب الٰہی بخش خاں معروف کے یہاں مرزا کی شادی قرار پائی۔ اور سات رجب ۱۲۲۵ھ کو تیرہ برس کی عمر میں اُن کا عقد ہو گیا۔ اسی تقریب سے دلی میں ان کی آمد و رفت بڑھی۔ اور آخر چند روز بعد مستقل طریقہ سے وہ دلی ہی میں آ رہے۔ مرزا کا کوئی ذاتی مکان دلی میں نہ تھا وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔ اور آخیر عمر میں حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے قریب رہتے تھے۔ اور اگرچہ فراخ دلی کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے۔ مگر معاش کی طرف سے وہ کبھی محتاج نہیں رہے۔

مرزا کی شاعری

بچپن ہی کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ اس فن میں انہوں نے کسی کو اپنا استاد قرار نہیں دیا۔ اور نہ کچھ پتہ چلتا ہے۔ کہ کوئی شاعری میں ان کا استاد تھا۔ وہ محض اپنی معنی یاب طبیعت۔ اور شاعری کے فطری مذاق کے سبب سے شاعر بنے۔ فارسی کی طرح اوّل اوّل ان کی اُردو شاعری بھی بیدل وغیرہ کے رنگ میں تھی۔ مگر چونکہ وہ طرز نہایت مشکل اور عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس وجہ سے

ان کے احباب نے ان کو مجبور کیا۔ اور آخر ان کو اپنا رنگ تبدیل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس رنگ کے چھوڑ دینے پر بھی ان کی شاعری بہت بلیغ رہی۔ مگر پھر بھی وہ پہلے کے مقابلہ پر بہت آسان ہو گئی۔ انہوں نے پچیس برس کی عمر تک اچھا خاصہ دیوان اسی رنگ میں جمع کر لیا تھا۔ مگر ان کے دلی دوست مولوی فضل حق صاحب اور کوتوال شہر نے اس کا انتخاب کیا۔ اور یہی دیوان وہ ہے۔ جس پر مرزا نے خود لکھا ہے۔ کہ میرا یہی کلام ہے۔ اس کے سوائے اگر اور کلام ہے تو وہ میرا نہیں ہے۔ مگر چونکہ زمانے نے حد سے زیادہ قدر کی۔ اس واسطے مرزا کا وہ کلام جو ایک زمانہ میں خود مرزا نے نظری کر دیا تھا۔ اب شائع ہو گیا۔ جس کا آسان اور عام فہم انتخاب ہم نے اس دیوان میں بطریق ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔

اگرچہ اوّل اوّل مرزا کے کلام کی قدر نہیں ہوئی۔ مگر جیسے ہی انہوں نے ایک نئی روش اختیار کی زمانہ میں دھوم مچ گئی۔ اور آخر کار ۱۲۶۶ھ میں ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب بھی دیا۔ اور ۱۲۷۱ھ میں جب ذوق مرحوم کا انتقال ہوا۔ تو مرزا کو بادشاہ نے غزلیں دکھانا اور اصلاح لینی شروع کی۔

اگرچہ مرزا دراصل فارسی شاعر تھے۔ اور ان کی فارسی ہی کی شاعری ان کے خیال کے بموجب ان کے لئے مایہ ناز ہے۔ مگر زمانہ نے ان کی اردو کی فارسی سے ہزار درجہ قدر زیادہ کی۔ اس کی چند وجوہات ہیں۔ جس میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ مرزا کے زمانہ تک شاعری جس شاہراہ پر تھی۔ مرزا نے اس سے انحراف کر کے ایک ایسا راستہ اختیار کیا۔ جس کے وہ موجد مانے گئے۔ اور اس وقت تک کسی نے اس رنگ میں غزل گوئی نہ کی تھی۔ یوں تو ان کے کلام کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اور اگرچہ بہ تفصیل لکھی جائیں تو وہ ایک کتاب ہو گی۔ مگر معنی آفرینی۔ درد کے ساتھ شوخی

حسن بیان۔ عوام سے بچ کر ہر بات کو کہنا۔ سادہ کلام کو نہایت سادگی سے ادا کرنا۔ مگر معانی بلند اور لطافت خیال ندرت بیان کو مدنظر رکھنا یہ سب باتیں ایسی ہیں۔ کہ اُن کے سوائے ہندوستان کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں اس وقت تک موجود نہیں ہیں۔

ان کی نثر بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ جس کی اردوئے معلےٰ عود ہندی شاہد ہیں۔

اسی طرح ان کی فارسی کی نثر قدمائے اہل ایران سے ملتی ہے عربی وُہ بالکل معمولی جانتے تھے۔ مگر اردو و فارسی کے زبردست اُستاد تھے۔ ان کی تصانیف شمار میں یوں ہیں۔ دیوانِ اُردو۔ اردوئے معلےٰ۔ عود ہندی۔ لطائف غیبی۔ تیغ تیز۔ ساطع برہان۔

تصانیف فارسی

قصائد۔ غزلوں کا دیوان۔ پنج آہنگ۔ نامہ غالب۔ مہر نیمروز۔ دستنبو۔ سبد چین۔ قاطع برہان۔ درفش کاویانی۔

ان کی طبیعت میں ظرافت اور مزاح کی چاشنی حد سے زیادہ تھی۔ وُہ اپنے چھوٹوں اور بڑوں سب سے قریب قریب ایک ہی طرح ملتے تھے۔ مگر وضعدار حد سے زیادہ تھے۔ عمر بھر اپنی وضع کی پابندی کا خیال رکھا۔ یہاں تک کہ آخر عمر تک احباب کے خطوط کا پڑے پڑے جواب لکھاتے تھے۔ اگرچہ بیماریوں اور مجبوریوں نے سلسلہ اصلاح اُتھال سے کچھ روز پہلے کانوں سے بالکل نہ سنائی دیتا تھا نقش تصویر بن گئے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا۔ تو لکھ کر رکھ دیتا تھا وُہ دیکھ کر جواب دے دیا کرتے تھے۔ غذا کی یہ کیفیت تھی۔ کہ دو تین برس پہلے سے پانچ سات بادام کا شیرہ بارہ بجے آب گوشت شام کو چار تلے ہوئے کباب کھاتے تھے۔

ضعف پیری نے اس قدر عاجز کردیا تھا۔ کہ ہمیشہ موت کے آرزومند

رہتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

غرض کہ ۷۳ برس کی عمر پاکر ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ کو دہلی میں عالم فانی کو خیرباد کہا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشام شمیم آشنایان را صلا دہاد و انجمن نشینان را مژده که لختے از سامان مجمره گردانی آماده و دوانے از عود ہندی دست بہم داده است. نه چو بہائے سنگ خورده بہنجار ناطبعی شکسته بے اندام تراشیده بلکه به ہنر شگافته بکار رود و ریز ریز کرده بسوہان خراشیده ابدون نفس بگداختگی شوق بجست وجوئے آتش پارسیست نه آتشے که در گلخنہائے ہند افسرده و خاموش و از کف خاکستر برگ خودش سیه پوش بینی چه بروے مسلم ست از ناپاکی باستخوان مرده نہادن شکستن و از دیوانگی برشته شمع مزار کشته آویختن ہر آئینه بدل گداختن بہرزد و بزم افروختن را نشاید رخ آتش بصبح برافروزنده و آتش پرست را بباد فراہم در آتش سوزنده نیک میداند. که پژوہنده در ہوائے آں رخشنده آذر نعل در آتش ست که بچشم روشنی ہوشنگ از سنگ بدل تافته و در ایوان لہراسپ نشو و نما یافته حسن را فروغ ست و لاله را رنگ و دغ را چشم و کده را چراغ بخشنده یزدان و دودن سخن برافروز را سپاسم که شرارے ازاں آتش تابناک بخاکستر خویش یافته بکاو بکاو سینه شتافته ام. و از نفس دمه برآں نہاده او که در اندک مایه روزگار آں مایه فراہم تواند آمد که مجمره را فر روشنائی چراغ در انجمه عود را بال شناسائی داغ تواند بخشید ہمانا نگارنده ایں نامه را آں در سر ست. که پس از انتخاب دیوان ریخته بگرد آوردن سرمایه دیوان پارسی برخیزد و باستعانه کمال ایں فرلیوفن پس زانوئے خویشتن نشیند. و امیدکه سخن سرایان سخنور ستائے پراگنده ابیاتے را که خارج ازیں اوراق یابند از آثار تراوش رگ کلک ایں نامه سیاه نشناسند و جامه گرد آورا ستائش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند. یارب ایں باد ہستی ناشنیده از نیستی به پیدائے نارسیده یعنی نقش بضمیر آنده نقاش که به اسد اللہ خان موسوم به میرزا نوشه معروف به غالب متخلص ست. چنانکه اکبرآبادی مولد دہلوی مسکن ست فرجام کار نجفی مدفن نیز باد.

غزلیات

1

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

2

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا!

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا!

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا!

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا!

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد!
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا!!

3

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا!
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

4

دلِ مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا!

۵

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا!

۶

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں!
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ نعش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۷

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بفیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ
مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

۸

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ ڈرا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسی نہ ہوا

۹

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۱۰

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی ۱۱
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

۱۲

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۱۳

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

۱۴

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

۱۵
نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بے تاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پرواہ نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

۱۶
اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

۱۷
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۱۸

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالمِ دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلےٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

۱۹

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۲۱

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا!
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

نفس موج محیط بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے!
غم آوارگی ہائے صبا کیا

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

سن اے غارتگر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگرداری کا دعوےٰ
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ خاطر ربا کیا

بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۲۲

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازش ہمتائی چشم خوباں!
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا ہے مرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا
کام کا ہے مرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُن مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دِجلہ دِکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

۲۳ پئے نذر کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا !
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست وپائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہاں ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی !
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

۲۴ گریہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط !!
شعلہ خس جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ہو جائے گا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

۲۵ درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وُہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے! — لیکے دل دلستاں روا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

۲۶ گلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب — مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی — دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں! — کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا
دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسد
جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

۲۷ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وُہ خفا مجھ پر ہوا

مطلع

۲۸ جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا — تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا
یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۲۹
میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں — وُہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

۳۰
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وُہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

۳۱
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وُہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۳۲
یک ذرۂ زمیں نہیں بےکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے!! — تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

۳۳
وُہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام!
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وُہ بد خواہ ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژہ یار سے دل تادمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۲۴

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا!!!
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی!!
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وُہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۵

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ جاتا تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا		نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام		ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی		آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق		آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا	۲۶	زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگاں کا

ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا	۲۷	اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے		خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے		آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم		میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں		یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک		میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا	۲۸	رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا		کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو		دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	۲۹	صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

٤٠

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اَور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

٤١

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وُہ بے مہر کس کا آشنا

ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلےٰ آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے
میرا زانو مونس اَور آئینہ تیرا آشنا

میں اَور آفت کا ٹکڑا وُہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دُشمن اَور آوارگی کا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

٤٢

ذِکر اس پری وش کا اَور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وُہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے!
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دے وُہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُنکو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مِٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی کر لیا ہے دُشمن کو
دوست کی شکایت میں ہمنے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

۴۳
سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم !!
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

۴۴
غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ — صید ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے — پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

۴۵
جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نجائے — آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۴۶
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

۴۷
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد — تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام — مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوئی — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دِل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھُلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

باب الباء

۴۸
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پُوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن!
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے!
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وُہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

باب التاء

۴۹
افسوس کہ دنداں کا کیا رزق خدا نے
جن لوگوں کے تھے درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

۵۰

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشق خوننابہ مشرب
لکھے ہے خداوند نعمت سلامت

علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

۵۱

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دُودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ رخسار دوست

خانہ ویراں سازی حیرت تماشا کیجئے
صورت نقش قدم ہوں رفتۂ رفتار دوست

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

چشم ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُر خوں ہمارا ساغر سرشار دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وُہ حدیث زلف عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

مہربانی ہائے دُشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاس لذت آزار دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالبؔ ز بس تکرار دوست

باب الجیم

۵۲

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

باب جیم فارسی

۵۳

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ!

باب دال مہملہ

۵۴

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا!
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

باب رائے مہملہ

٥٥

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدم یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیٔ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیٔ عیش مقدم سیلاب !
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریف راز محبت مگر در و دیوار

٥٦

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض !
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

٥٧

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سر گرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق!
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھسے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وُہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۵۸

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کی نہووے مہر عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا!
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

۵۹

ہے بس کہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وُہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند!
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا / ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے / جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا / ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین / کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے / رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے! / کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

۶۰ صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر / تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامان عشق و جاہ سے تدبیر وحشت کی / ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

۶۱ جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی / گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی! / ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے / متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے / شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا / فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے / کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

۶۲ ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں / تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور / تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا / ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں / مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے / کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف / کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے / پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
تم کونسے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے / کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

باب زائے معجمہ

۶۳ فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر
ہوں گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں!
خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

۶۴ حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعت مے خانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

۶۵ وسعت سعیٔ کرم دیکھ کہ سر تا سر خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابر گہر بار ہنوز

یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تب گرمیٔ رفتار ہنوز

۶۶ کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۶۷ نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہوں گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

باب سین مہملہ

٦٨ مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

باب شین معجمہ

٦٩ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

باب عین مہملہ

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع ۱۷ ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع
غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع
ترے خیال سے روح احتراز کرتی ہے بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

باب الفا

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش ۲۷ مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

باب کاف تازی

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک ۳۷ کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گرد راہ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل / ورنہ ہوتا ہے جہاں کس قدر پیدا نمک

مجھے ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو / نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج / گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ / یاد کرتا ہے مجھے دیکھے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے / دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد / زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

۷۴

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک / کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ / دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب / دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن / خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم / میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل / گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

باب کاف فارسی

۷۵

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ / یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

باب اللام

۷۶

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل / بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف		ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا		اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل
خوشحال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو		رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل سر بپائے گُل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار		میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے		مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل
سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی		خُوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک		بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

غالبؔ مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

باب المیم

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس	۷۷	برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال		ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بتخانہ ہم
باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں		ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو		ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

بنالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر	۷۸	متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور	۷۹	رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم

باب النون

لوں دامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے	۸۰	غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

۸۱
وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے! — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا! — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق! — واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

۸۲
کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں — ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے — اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے — خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اِک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ — اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں!

۸۳
آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے کچھ باقی اے گریہ مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب — ذرے اُسکے گھر کے دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے — پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہم ہیں اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا!
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

۸۴

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

غالب مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

۸۵

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۸۶

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو!
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

۸۷

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مرا امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ق

ہر چند جانگدازیٔ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیٔ تاب و تواں نہیں

جاں مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عار دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگر مرا ہمزباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالِب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۸۸

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگۂ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو!
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

غالِب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مطلع

۸۹

مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں

۹۰

برشگال گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوارِ چمن

الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے باوصف آزادی گرفتارِ چمن

۹۱

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

۹۲

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
سراغِ تفِ نالہ داغِ دل سے — کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۹۳

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شبہائے ہجر کو بھی کو رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اَور لکھ رکھوں — مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے — ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں اَور حظِ وصل خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
تیوری جو ہے چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑا ہوا طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے — جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے ۔۔۔ جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

۹۴
کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ۔۔۔ یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہے آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۔۔۔ گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع ۔۔۔ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔۔۔ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے ۔۔۔ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۔۔۔ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۔۔۔ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ! ۔۔۔ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ۔۔۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

۹۵
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں ۔۔۔ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ۔۔۔ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار ! ۔۔۔ اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے ۔۔۔ کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ۔۔۔ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ۔۔۔ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار ۔۔۔ کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار ۔۔۔ جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا ۔۔۔ سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز

دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

٩٦ ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق — مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم! — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
حسرت اے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشق پر عربدہ کی گوں تن رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو! — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

٩٧ نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں!
عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں!
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں
وائے محرومی تسلیم و بدا حوال وفا! — جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں
رنگ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے — گر چراغان سر رہ گزر باد نہیں
سبد گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں — مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

٩٨ دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں		
ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر	۹۹	عشق کا اس کو گماں ہم بیزبانوں پر نہیں
قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا	۱۰۰	تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
دل نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالب		
نہ کر سرگرم اُس کافر کو الفت آزمانے میں		
دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا	۱۰۱	بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام		
مہر گردوں ہے چراغ رہگزار باد یاں		
یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۱۰۲	کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے		کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو		یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں		
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں		
نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں	۱۰۳	شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے		بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں		جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں		کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب		گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام		دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُن کے وعدہ کا ذکر اُنسے کیوں کرو غالب		
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں		
تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں!	۱۰۴	ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے		ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر		برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قید ہستی سے رہائی معلوم		اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد ۱۰۵ وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

۱۰۶
دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے!
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا!
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۱۰۷
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹجاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

۱۰۸

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنے ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائش عداوت اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقت خلش خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تار اشک یاس رشتہ چشم سوزن میں

ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی
کف سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شب مہ ہو جو رکھدوں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانع بیربطی شور جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینہ میں مثل ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھکو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسد زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

۱۱۰

مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

۱۱۱

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ہنسائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہگئی بوالہوس کی شرم
اپنے اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جسکو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

۱۱۲

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے رو برو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

باب الواؤ

۱۱۳
حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

۱۱۴
کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلم سر نوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

۱۱۵
وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی!
عمرِ عزیز صرفِ شہادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

۱۱۶

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا!
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

۱۱۷

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

118 واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار | یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوق ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

119
واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو | صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے | کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن | تیرے کوچہ سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو | یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
رشک ہمطرحی و درد اثر بانگ حزیں | نالۂ مرغ سحر تیغ دو دم ہے ہم کو
سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا | ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار | پاس بے رونقیٔ دیدہ اہم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو | ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنے | ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر | عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

120
تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو | مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے | قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہیں | مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار | مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید | مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست | لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو!

۱۲۱
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو — کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے — حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا — بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار — یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور
فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

۱۲۲
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں — عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۱۲۳
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

باب ہائے ہوز

۱۲۴ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ — طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

۱۲۵ ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ — جس کی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

ناچار بےکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

باب الیاء

۱۲۶ صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق — یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

۱۲۷ مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے
دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی — ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیئے
ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی — رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

	نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے	
بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی	۱۲۸	سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے		تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے		مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم		کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ		مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے		لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
	مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی	
ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے	۱۲۹	تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہ پریشانیِ صہبا		یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد		زنہار نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں سے
	بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے	
تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا	۱۳۰	سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
	غالب ترا احوال سناویں گے ہم انکو وُہ سن کے بلالیں یہ اجارا نہیں کرتے	
	۱۳۱	
	گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا وُہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے	
غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی	۱۳۲	فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب		قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے		ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا		اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی اِلتفات ناز پر مرنا — ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لگد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی — مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

۱۲۳ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی — دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھاوے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

۱۲۴ کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے — جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ — غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے
کی اُس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا — آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا — بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں! — فرماں روائے کشور ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا! — کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اسقدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

۱۲۵ درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری ہائے ہائے
گلفشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموس پیمان محبت مل گیا! — اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشکال | ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال! | ایک دل تِس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

۱۲۶ ہر گشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے | تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر! | ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک! | ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا | ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ ماہتاب میں شراب | اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

۱۲۷ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے | خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ | دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا | رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی | اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان | نافِ زمین ہے کہ یہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا | دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۱۲۸ تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو | حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

۱۳۵ ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا | ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں | ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا | ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستئ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

۱۴۰
پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

۱۴۱
مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائی شوخئ اندیشہ تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

۱۴۲
رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے
نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے

۱۴۳
چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ آواز ہے

پیکر عشاق ساز طالع ناساز ہے
نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے

دستگاہ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرش پا انداز ہے

۱۴۴
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۴۵

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے   صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈھے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی   جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال   تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں   آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

۱۴۶

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۱۴۶

۱۴۷

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے   بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا   میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے   مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر   حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو   کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں   بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

۱۴۸

رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے!   اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مے ہے سرو نشاط بہار مے   بال تدرو جلوۂ موج شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا   نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جاداد بادہ نوشی رنداں ہے شش جہت   غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کی نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے!
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱۴۹
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہردم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اسکی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۱۵۰
گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

۱۵۱
کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

۱۵۲
اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۵۳

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجوم نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بیحاصل میں ہے

رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کِسکے آب و گل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

۱۵۴

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا!
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وُہ ولولے کہاں وُہ جوانی کدھر گئی

۱۵۵

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا

تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

۱۵۷
کوئی دن گر زندگانی اَور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے
دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم ! — وُہ بلائے آسمانی اَور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

۱۵۸
کوئی اُمید بر نہیں آتی ! — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اُدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہُوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

۱۵۹
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اَور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ! — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اَور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

۱۶۰
کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پُوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وُہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وُہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اَور تری تقدیر کو رو آئے

۱۶۱
پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روز بازارِ جاںسپاری ہے

پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

قطعہ

۱۶۲ پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازار فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب — اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۶۳ جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی — نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی — ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

۱۶۴ نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی — مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے — اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت — کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اسکے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۱۶۵ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے — یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر — وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق!
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱۶۵

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

۱۶۶

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا!
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱۶۷

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ رونے پہ بھی اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر — خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی — غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے میکشی کی کھائی ہے قسم غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۶۸ ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے — کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچہ و گل کا صدائے خندۂ دل ہے

۱۶۹ پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے!
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے!

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۱۷۰ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبد صورت دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر! — تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب ناز گرانمایگی اشک بجا ہے!! — جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک — آغوش خم حلقۂ زنار میں آوے
غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر! — کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے
جب چاک گریباں کا مزا ہے دل نالاں — جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتشکدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے — اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

٧١

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے / اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ / جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا / ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے / وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق / وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض / اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا / جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جاوے تو دریا ہو جائے / کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز / شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن / دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

٧٢

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی / امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے / شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے / ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا / گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلی نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق / نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا / گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو / نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

٧٣

عجب نشاط سے جلاد کے چلیں ہیں ہم آگے / کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت / فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی / وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا / کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے / تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

۱۷۴

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو!
شکوۂ جور سے سر گرم جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

ق

خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزم سخن!
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہ کواکب سپہ مہر علم!
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۱۷۵

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفت گو کیا ہے

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہُوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

١٧٦

میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاشکے کہ تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اَور بھی جیے ہوتے

١٧٧

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر — دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

١٧٨

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی!!

١٧٩

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے — اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

رہا آباد اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

۱۸۰
کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار — مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال — بھول جاتا ہے نشانی میری
متقابل ہے مقابل میرا — رک گیا دیکھ روانی میری
قدر سنگ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری
گردِ بادِ رہِ بیتابی ہوں — صرصرِ شوق ہے بانی میری
دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا — کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

۱۸۱
نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے — غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تبِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

۱۸۲
گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے — ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر — یاں نالہ کو اور اُلٹا دعویٰ رسائی ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

۱۸۳
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور — دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے — یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو — خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

١٨٤ سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم — حیراں کئے ہوئے ہیں دل بیقرار کے

آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

١٨٥ ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں ! — معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیئے

١٨٦ چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
صحبت رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے
چاک مت کر جیب بے ایام گل — کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیئے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اسکی دیکھا چاہیئے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

١٨٧ ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر — ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشت آتش دل سے شب تنہائی میں — صورت دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں — کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں — صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی بستۂ تمہید فراغت ہو جو ! — پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے — ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

۱۸۸
نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جا
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اسنے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۱۸۹
چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے

میکدہ گر چشمِ مست ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت ذخط
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

۱۹۰
وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے	٩١	مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے		دل بیدست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو		فروغِ شمع بالیں طالعِ بیدار بستر ہے
بطوفانگاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی		شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی		ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے		غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے !	٩٢	نالہ پابندِ نے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے		گر باغ گدائے مے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے		پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی !		ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے		اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد		مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا	٩٣	کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	٩٤	مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی		ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے

غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

۱۹۵ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ — خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے
کبھی تو اس دل شوریدہ کی بھی داد ملے — کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سنے نالہائے بلبل زار — کہ گوش گل نم شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اسد ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
مقام ترک حجاب و وداع تمکیں ہے

۱۹۶ کیوں نہ ہو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو — یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی — وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

۱۹۷ دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے — ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے
رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب — اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہمکو فریب — کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال — کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے
تمہیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال — ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے
انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے — ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے — ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے

کہا کسی نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

۱۹۸ دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے — کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں — مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے — جانتا ہے محو پرسشہائے پنہانی مجھے
میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے — اسقدر ذوق نوائے مرغ بستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے!

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

١٩٩ یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن!
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

٢٠٠ حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!
اسے یوسف کے بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے گر دل میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گرآئے
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخ کی آزمائش ہے

٢٠١ کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں یاد کر کے اپنی شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے!
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی!
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے ! — نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن — وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۲۰۲

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے — کشاد و بستِ زباں سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی — تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ — نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعویٔ عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

۲۰۳

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم — واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر باندازِ عتاب ! — کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

۲۰۴

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار ! — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۲۰۵

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے!

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

جو مدعی بنے اُسکے نہ مدعی بنیے!
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھیے
کہیں مصیبت ناسازی دوا کہیے

کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے
کہیں حکایت صبر گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانی روش و مستی ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

۲۰۶

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس خاک ہو گئے

صرف بہائے مے ہوئے آلات میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر!
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے کل اُس نے اُٹھائی اسد کی نعش

دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۲۰۷
نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

۲۰۸
عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعوئ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

۲۰۹
حسنِ بے پروہ خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ وا گر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

۲۱۰
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلےٰ کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

۲۱۱
ابن مریم ہوا کرے کوئی / میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی / ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر / دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے / وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ / کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی! / نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی! / بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند / کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے / اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی!

۲۱۲
بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے / غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۲۱۳
باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے / سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم / ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے
مدعا محو تماشائے شکست دل ہے / آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک / آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی / اترائے کیوں نہ خاک سر رہگزار کی
جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ / لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے

	کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی	
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	۲۱۵	بہت نکلے مرے ارمان ولیکن پھر بھی کم نکلے
ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُسکی گردن پر		وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن		بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے
بھرم کھلجائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا		اگر اس طرّہ پرپیچ وخم کا پیچ وخم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُسکو خط تو ہم سے لکھوائے		ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھسے بادہ آشامی		پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے
ہوئی جنکی توقع خستگی کی داد پانے کی		وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا		اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
	کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے	
کوہ کے ہوں بار خاطر گر ہوا ہو جائیے	۲۱۶	بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہو جائیے
	بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے	
مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے	۲۱۷	موج شراب یک مژۂ خوابناک ہے
جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو		جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
	جوش جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں مجھے صحرا ہماری آنکھ میں یک مشت خاک ہے	
لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی	۲۱۸	قیامت کشتہ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے
آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے	۲۱۹	نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
	بزم مے وحشت کدہ ہے کسکی چشم مست کا شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے	
ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا	۲۲۰	مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے
۲۲۱	سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی	

۲۲۲

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطف بدخویاں
نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی
کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی اگر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دستگرداں ہے

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

۲۲۳

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے!
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم!
صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغ نگاہ
کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے

۲۲۴

جس جا نسیم شانہ کش زلف یار ہے
نافہ دماغ آہوئے دشت تتار ہے

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبار شوق
گر دام یہ ہے وسعت صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پر آب
اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادئ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

۲۲۵

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں
گلدستہ نگاہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار تمنا کہیں جسے

سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

۲۲۶

شبنم بہ گُل لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظرگاہِ حیا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بانداز گُل آغوش کشا ہے

تو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوئ گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

۲۲۷

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

۲۲۸
غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی!
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ انکو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۲۲۹
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر گرمِ نالہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا!
جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش گریہ سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

۲۳۰

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہے نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے کہ ایک میں ہی نہیں
درازدستی قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ خوش تھا مری جو آفت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل!
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے!
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا!
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

تمام شد

بی۔اے ذوقی خوشنویس لاہور

قصائد

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایہ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

مستی باد صبا سے ہے بعرض سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستی ابر سے گلچین طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل
راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم
سرنوشت دو جہاں ابر بیک سطر غبار

کاٹکر پھینکئے ناخن تو باندازِ ہلال
قوت نامیہ اس کو بھی نچھوڑے بیکار

کف ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی
بھول جا یک قدح بادہ بطاق گلزار

موج گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانی اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثل خط نوخیز ہو خط پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمہ مدحت شاہ
طوطئ سبزہ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار

فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور
رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار

سبزہ نہ چمن و یک خط پشت لب بام
رفعت ہمت صد عارف و یک اوج حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پر کاہ
وہ رہے مروحۂ بال پری سے بیزار

خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا
چشم نقش قدم آئینہ بخت بیدار

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی اُمید کو احرام بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلب مستیِ ناز
عرض خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج بہار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دلِ پروانہ چراغاں پرِ بلبل گلزار

شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلک اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبیؐ
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار

جوہر دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازش مژگاں و دگر سو غم خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاک در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دشمن آل نبیؐ کو بہ طرب خانۂ دہر
عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاق دیوار

دیدۂ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتو شوق
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

قصیدہ

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسیں

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُرد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم
صورت نقش قدم خاک بفرق تمکیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آئینۂ حسن یقیں

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب ۔ بیستوں آئینۂ خواب گران شیریں

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز ۔ کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن ۔ نہ سر و برگ ستائش نہ دماغ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ ۔ یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر ۔ یا علیؑ عرض کر اے فطرت وسواس قریں

مظہر ذات خدا جان و دل ختم رسل ۔ قبلۂ آل نبیؐ کعبۂ ایجاد یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرم خرام ۔ ہر کف خاک ہو واں گردۂ تصویر زمیں

جلوہ پرداز ہو نقش قدم اس کا جس جا ۔ وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی امیں

نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے ۔ ابداً پشت فلک خم شدۂ ناز زمیں

فیض خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا ۔ بوئے گل سے نفس باد صبا عطر آگیں

برش تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا ۔ قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے ۔ رنگ عاشق کی طرح رونق بتخانۂ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا ۔ وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر ۔ نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب ۔ شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ ۔ رقم بندگی حضرت جبریل امیں

ترے در کے لئے اسباب نثار آمادہ ۔ خاکیوں کو جو خدا نے دئیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں ۔ تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا ۔ کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں

جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد ۔ کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب ۔ ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن قبول ۔ کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غم شبیرؑ سے ہو سینہ یہاں تک لبریز ۔ کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفت دلدل میں یہ سرگرمی شوق ۔ کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا — نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں
حرف اعدا اثر شعلۂ دود دوزخ — وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

قصیدہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام — جسکو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردش ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرور خاص خواص — حبذا اے نشاط عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرز استفہام
مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روزہ بر سبیل دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بتقریب عید ماہ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوے بخشش خاص — گر تجھے ہے امید رحمت عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ !
جب کہ چودہ منازلِ فلکی !
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز !

کیا نہ دے گا مجھے مےِ گلفام
کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا ہے لگام !

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے !
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اس قدح کا ہے دور مجھکو نقد
بوسہ دیتے ہیں ان کو ہے انکار

تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
غم سے جب زیست ہو گئی ہو حرام
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام !

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ

اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
نامِ شاہنشہِ بلند مقام
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم!
رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافیٔ ناوک
آفریں آبداریٔ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف!
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں!
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی!
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسمِ شحنۂ عام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی!
وہی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبح دم دروازۂ خاور کھلا ‏ مہر عالمتاب کا منظر کھلا

خسرو انجم کے آیا صرف میں ‏ شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود ‏ صبح کو راز مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ‏ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو ‏ موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانب مشرق نظر ‏ اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب رد سحر ‏ بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے ‏ رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا

بزم سلطانی ہوئی آراستہ ‏ کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاج زریں مہر تاباں سے سوا ‏ خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

شاہ روشندل بہادر شہ کہ ہے ‏ راز ہستی اس پہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں ‏ مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے ‏ عقدۂ احکام پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ‏ اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے ‏ واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ‏ تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا

نقش پا کی صورتیں وہ دلفریب ‏ تو کہے بت خانۂ آزر کھلا

مجھ پہ فیض تربیت سے شاہ کے ‏ منصب مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ‏ میری حد وسع سے باہر کھلا

تھا دل وابستہ قفل بے کلید ‏ کسنے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار ‏ مجھسے گر شاہ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرم غزلخوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں
کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوز دل کا کیا کرے باران اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامہ کے ساتھ آ گیا پیغام مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی!
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا
بادشاہ کا رایت لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوئے پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیار آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآل سعئ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور!
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ و بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن باوجودِ غمگینی!
جان دینے میں اس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر!
کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے بحکمِ رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار!
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ!
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
نازپروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزِ شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وُہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور!
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو!

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام
تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قرب کلیم
تجھ سے دُنیا میں بچھا مائدۂ بذل خلیل

بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ!
بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین
تیری بخشش مری انجاح مقاصد کی کفیل

تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید!
تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں
چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل

پیچھے ڈالے ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکے ہے بن ناخن تدبیر میں کیل

تپش دل نہیں بے رابطۂ خوف عظیم
کشش دم نہیں بے ضابطۂ جر ثقیل

دُر معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر
کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

ایضاً

گئے وُہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندہ جانے دو ملجاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

وُہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وُہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
کہ وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھیے
حرز بازوئے شگرفان خود آرا کہیے

مسی آلودہ سر انگشت حسیناں لکھیے
داغ طرف جگر عاشق شیدا کہیے

خاتم دست سلیماں کی مشابہ لکھیے
سر پستان پریزادسے مانا کہیے

اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجیے
خال مشکین رخ دلکش لیلےٰ کہیے

حجر الاسود دیوار حرم کیجیے فرض
نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے

وضع میں اس کو سمجھ لیجیے قاف تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز
میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے

کیوں اسے قفل در گنج محبت لکھیے
کیوں اُسے نقطۂ پرکار تمنا کہیے

کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجیے
کیوں اسے مردمک دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اُسے تکمہ پیراہن لیلا لکھیے
کیوں اسے نقش پئے ناقہ سلما کہیے

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

بیانِ مصنّف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی !
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے !

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر !
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر !!!
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مکرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی چمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں اگر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو تری بات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

متفرقات

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مۓ مشکبو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ خواند

بٹتے ہیں سونے چھلے کے رپے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدہ کو سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی!
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں بادشاہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ذوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر تا نہ دے باد زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے! اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا! ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنئے ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم میرا ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ! تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے	نمبر ۱	جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے !		کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے
سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی	نمبر ۲	مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد		تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے
خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر	نمبر ۳	کہ جسکے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب	تاریخ	نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محفوظ ۱۸۸
ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی	نمبر ۴	ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے	تاریخ	تو بولا انشراح جشن جمشید
گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں	قطعہ	دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام	دیگر	اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال		ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم		اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال
شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا	ایضاً	کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک		ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا
آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال	ایضاً	ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی		لڑکوں کے لئے گیا ہے کھیل نکال
دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی	ایضاً	بیتابی رشک و حسرت دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس		تکرار روا نہیں تو تجدید سہی
ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے	ایضاً	وحشت کدہ تلاش لڑنے کے لئے

یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد!
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

ایضاً
دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا!
اس سے گلہ مند گیا ہے گویا!
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا!

ایضاً
دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

ایضاً
مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

ایضاً
بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ایضاً
ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثار جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شب قدر و دوالی باہم

ایضاً
حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

ایضاً
اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

ایضاً
کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا!
کیونکر مانوں کہ اسمیں تلوار نہیں

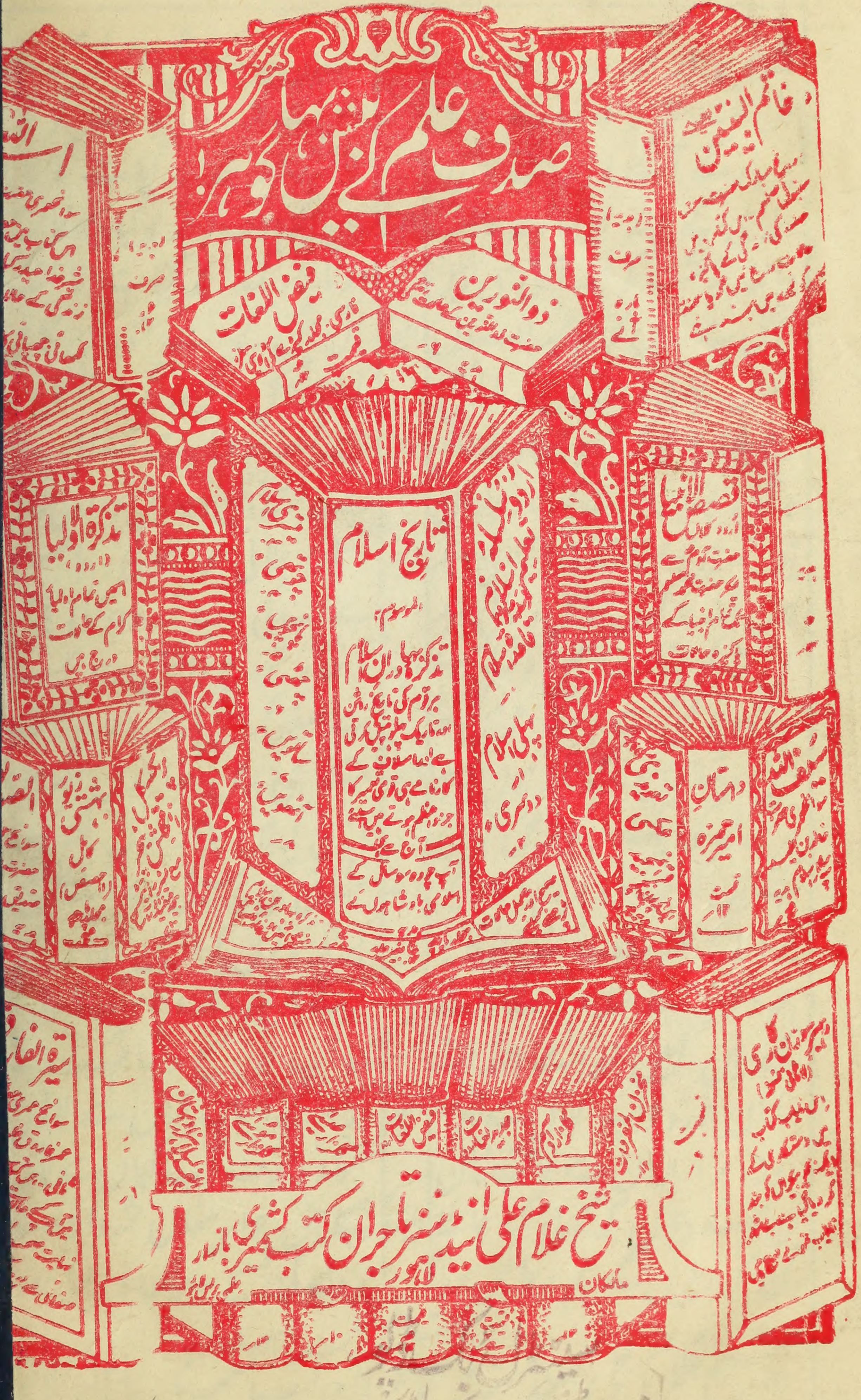
ایضاً
ہم اگرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں ورنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

ایضاً
سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

ایضاً
ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

تمام شد

شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور


صدفِ علم کے بیش بہا گوہر!
ذوالنورین
فیض اللغات
خاتم النبیین
تذکرۃ الاولیا
قصص الانبیا
تاریخ اسلام
تذکرہ بہادرانِ اسلام
داستان امیر حمزہ
شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور